رسائل و مسائل

حجرِ اسود اور خانۂ کعبہ کے متعلق غیر مسلموں کی غلط فہمیاں

سوال:۔ "یہاں (اسلامک کلچرل سنٹر لندن میں) چند انگریز لڑکیاں جمعہ کے روز آئی ہوئی تھیں۔ بڑے غور سے نماز کو دیکھتی رہیں۔ بعد میں انہوں نے ہم سے سوال کیا کہ آپ لوگ جنوب مشرق کی طرف منہ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں؟ کسی اور طرف کیوں نہیں کرتے؟ کعبہ کو کیوں اہمیّت دیتے ہیں؟ سنگِ اسود کو کیوں چومتے ہیں؟ وہ بھی تو ایک پتھر ہے جیسے دوسرے پتھر۔ اس طرح تو یہ بھی ہندوؤں ہی کی طرح بُت پرستی ہو گئی۔ وہ سامنے بُت رکھ کر پُوجتے ہیں اور مسلمان اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم انہیں تسلّی بخش جواب نہ دے سکے۔ براہِ کرم ہمیں اس کے متعلق کچھ بتائیں تاکہ پھر ایسا کوئی موقع آئے تو ہم معترضین کو سمجھا سکیں۔"

جواب ۔ قریب قریب اسی مضمون کے متعدّد سوالات ہندوستان کے مختلف حصّوں سے بھی حال میں ہمارے پاس آئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ آج کل جگہ جگہ یہ سوال مسلمانوں کے سامنے چھیڑا جا رہا ہے۔ ان معترضین میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد کسی نہ کسی طرح اسلام پر اعتراض جڑنا ہوتا ہے اور دنیا میں کوئی جواب بھی ان کے لیے تسلّی بخش نہیں ہو سکتا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں حقیقتِ حال سے ناواقفیت کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ شکوک پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ آپ انہیں معقولیت کے ساتھ حقیقت سے آگاہ کر دیں۔

بُت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کے مختلف گروہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بعض دوسری ہستیوں کو بھی خدائی کی صفات اور اختیارات کا حامل سمجھتے ہیں، یا یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

ان کے اندر حلول کیا ہے، اور اس غلط عقیدے کی بنا پر وہ ان ہستیوں کے مجسمے اور آستانے بنا کر ان کے آگے عبادت کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ کا بُت آج تک کسی مُشرک قوم نے نہیں بنایا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے کبھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کی کوئی خیالی شکل تیار کر کے اس کے آگے سر بسجود ہوں۔ دنیا کے تمام مشرکین قریب قریب صاف طور پر یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شکل و صورت سے منزّہ ہے۔ اُس کا اور دوسرے معبودوں کا فرق اُن کے عقائد اور مذہبی مراسم میں نمایاں طریقے سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے بُت صرف دوسرے معبودوں ہی کے بنائے گئے ہیں۔ اللہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

بُت پرستی کی اس حقیقت کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لے گا وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ مسلمانوں کا نماز میں خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کرنا، یا حج میں کعبے کا طواف کرنا اور حجرِ اسود کو چُومنا بُت پرستی سے کوئی ادنیٰ سی وجہِ مماثلت بھی رکھتا ہے۔ اسلام خالص توحیدی مذہب ہے جو اللہ کے سوا سرے سے کسی کو معبود ہی نہیں مانتا اور نہ اس بات کا قائل ہے کہ اللہ نے کسی کے اندر حلول کیا ہے، یا وہ کسی مادّی مخلوق کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ خانۂ کعبہ کو اگر غیر مسلموں نے نہیں دیکھا ہے تو اس کی تصویریں تو بہرحال انہوں نے دیکھی ہی ہیں۔ کیا وہ راستبازی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بُت ہے جس کی ہم پرستش کر رہے ہیں؟ کیا کوئی شخص بدرستیٔ ہوش و حواس یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چوکور عمارت اللہ رب العالمین کی شکل پر بنائی گئی ہے؟ رہا حجرِ اسود کا بوسہ، تو اسے بُت پرستی کے قبیل کی کوئی چیز سمجھنا تو اور بھی زیادہ نادانی کی بات ہے۔ حجرِ اسود ایک چھوٹا سا پتھر ہے جو خانۂ کعبہ کی چار دیواری کے ایک کونے میں قدِ آدم کے برابر بلندی پر لگا ہوا ہے۔ مسلمان اُس کی طرف رُخ کر کے سجدہ نہیں کرتے، بلکہ خانۂ کعبہ کا طواف اس مقام سے شروع کر کے اسی مقام پر ختم کرتے ہیں، اور ہر طواف اسے بوسہ دے کر، یا اس کی طرف اشارہ کر کے شروع کرتے ہیں۔ اس کا آخر بُت پرستی سے کیا تعلق ہے؟

اب رہی یہ بات کہ دنیا بھر کے مسلمان خانۂ کعبہ ہی کی طرف رُخ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں، تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ مرکزیت اور تنظیم کی خاطر ہے۔ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے

ایک مرکز اور ایک رُخ متعیّن نہ کر دیا گیا ہوتا تو ہر نماز کے وقت عجیب افراتفری برپا ہوتی۔ انفرادی نمازیں ادا کرتے وقت ایک مسلمان کا منہ مغرب کی طرف ہوتا تو دوسرے کا مشرق کی طرف، تیسرے کا شمال کی طرف اور چوتھے کا جنوب کی طرف۔ اور جب مسلمان نماز باجماعت کے لیے کھڑے ہوتے تو ہر مسجد میں ہر نماز سے پہلے اس بات پر ایک کانفرنس ہوتی کہ آج کس طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جائے۔ یہی نہیں بلکہ ہر مسجد کی تعمیر کے وقت ہر محلّے میں یہ جھگڑا برپا ہوتا کہ مسجد کا رُخ کس طرف ہو! اللہ تعالیٰ نے ان سارے امکانات کو ایک قبلہ مقرر کر کے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اور قبلہ اُسی جگہ کو بنایا جسے فطرةً مرکزیت حاصل ہونی چاہیے تھی، کیونکہ خدا پرستی کی یہ تحریک اُسی جگہ سے شروع ہوئی تھی، اور خدائے واحد کی پرستش کے لیے دنیا میں سب سے پہلا معبد وہی بنایا گیا تھا۔

بغاوت کے مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

سوال :- "خلافت میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک" کی جو کچھ تشریح آپ نے ترجمان القرآن میں پیش کی ہے اس کے ضمن میں بعض واقعات جو بعض کتابوں کے حوالہ سے نقل کیے گئے ہیں افسوس ہے کہ ان کے ساتھ اتفاق کرنا مشکل ہے۔ بعض واقعات جس انداز سے پیش کیے گئے ہیں اس سے تو امام ابوحنیفہ کے مسلک کے بارے میں قارئین ترجمان القرآن بہت بڑی غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں۔ بلکہ امام کے مسلک میں انہیں کھلا ہوا تضاد معلوم ہو سکتا ہے اگر انہوں نے مسلک امام کے متعلق کچھ فقہی معلومات حاصل کیے ہوں۔ سر دست میں ایک واقعہ کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو متعلقہ مسئلہ کی قسط دوم میں بیان کیا گیا ہے اور جس کا حوالہ ابن الاثیر اور کردری کے علاوہ المبسوط ج ۱۰، ص ۱۲۹ پر دیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اہلِ موصل کی بغاوت سے متعلق ہے۔ اس کو آپ نے ایسے انداز سے پیش کیا ہے جس سے ایک قاری بجز اس کے کہ اس کو مسلمان رعایا کی بغاوت سے متعلق سمجھے، دوسرا کوئی

مطلب نہیں لے سکتا۔ حالانکہ یہ واقعہ مبسوط کی تصریح کے مطابق مشرکین کی بغاوت سے متعلق ہے جو موصل کے رہنے والے تھے اور جن کے ساتھ "دوانیقی[1] نے صلح کی تھی۔ اس واقعہ میں آپ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ منصور نے اہل موصل سے حائیہ بغاوت کرنے سے پہلے جو عہد لیا تھا وہ ان کے خون اور مال سے متعلق تھا کہ آئندہ اگر وہ بغاوت کریں گے تو اُن کے خون اور مال اس پر حلال ہوں گے"۔ اور اسی معاملہ کے متعلق منصور نے فقہاء کی ایک جماعت سے جس میں امام ابو حنیفہؒ بھی موجود تھے یہ پوچھا تھا کہ" معاہدے کی رُو سے ان کے خون اور مال مجھ پر حلال ہو گئے ہیں یا نہیں؟۔ اور اسی کے متعلق امام نے کہا تھا کہ:" اہل موصل سے ہاتھ روک لیجیے۔ ان کا خون بہانا آپ کے لیے حلال نہیں ہے"۔ حالانکہ مبسوط کی عبارات سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاہدہ باغیوں کے خون اور مال کی حلّت و حرمت سے متعلق نہیں تھا بلکہ ان قیدیوں کے قتل سے متعلق تھا جو مشرک تھے اور باغیوں نے انہیں بطورِ "رہن" مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا[2] اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدیوں کی حیثیت سے تھے۔ اور چونکہ معاہدے میں جانبین نے یہ شرط مقرر کر رکھی تھی کہ اگر ایک فریق نے دوسرے فریق کے قیدیوں کو قتل کر دیا تو دوسرا فریق بھی اس کے قیدیوں کو قتل کر سکے گا، اور اہلِ موصل نے ان مسلمان قیدیوں کو پہلے قتل کر ڈالا تھا جو ان کے ہاتھوں میں قیدیوں کی حیثیت سے تھے، اس لیے علماء سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ ہم ان مشرک قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو باغیوں کی طرف سے ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ تو ان قیدیوں کے قتل کے متعلق امام اعظم نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ یہ آپ کے لیے حلال نہیں ہے"۔ نہ کہ امام اعظم نے مسلمان رعایا کی بغاوت کے متعلق خود باغیوں کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ ان کا قتل جائز نہیں ہے۔

اس کے علاوہ خود باغیوں کے بارے میں امام اعظمؒ یہ فتویٰ دے کیسے سکتے تھے کہ ان کا

---

[1] دوانیقی سے مراد خلیفہ منصور ہی ہے جسے کنجوسی کی بنا پر دوانیقی کہا جاتا تھا یعنی پائی پائی پر جان دینے والا۔ (ترجمان)

[2] "رہن" سے مراد قیدی نہیں بلکہ یرغمال ہیں (ترجمان)

قتل جائز نہیں ہے" جبکہ امام سرخسی نے اسی باب کی ابتدا میں باغیوں کے بارے میں امام اعظمؒ کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ باغی لوگ جب ایسے امام سے بغاوت کریں جس کی وجہ سے ملک میں عام امن و امان قائم ہو گیا ہو (خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو) تو ان کا قتل واجب ہے"

فان کان المسلمون مجتمعین علی واحد وکانوا آمنین بہ والسبیل آمنة فخرج علیه طائفة من المسلمین فحینئذٍ یجب علی من یقوی علی القتال ان یقاتل مع المسلمین الخارجین (ج ۱۰، ص ۱۲۴) امام سرخسیؒ نے اس حکم کے لیے جو دلائل بیان کیے ہیں ان میں ایک یہ آیت کریمہ بھی ہے :- فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ - قرآن کے اس صریح حکم کے مقابلے میں امام اعظمؒ آخر کیسے یہ جرأت کر سکتے تھے کہ باغیوں کا قتل جائز نہیں ہے" اس بارے میں امام سرخسیؒ نے مبسوط میں جو تفصیل پیش کی ہے، میں اُسے یہاں نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ خود اس مقام پر دوبارہ نظر ڈال کر ترجمان القرآن کے ذریعہ اس خط کے جواب میں اپنے مضمون کی اصلاح فرمائیں گے۔ اور خط بھی فائدہ عام کے لیے شائع کریں گے "

جواب - غالباً آپ نے سرسری طور پر میرے مضمون میں اس مقام کو دیکھا اور جلدی میں اظہارِ رائے فرما دیا۔ جس جگہ یہ بحث آئی ہے وہاں زیرِ بحث مسئلہ یہ نہ تھا کہ اہلِ موصل کے معاملے کی فقہی نوعیت کیا تھی، بلکہ یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اظہارِ رائے کے معاملہ میں کس قدر جری اور بے لاگ تھے۔ اسی بنا پر میں نے اس جگہ یہ بحث نہیں کی کہ اہلِ موصل کا اصل معاملہ کیا تھا۔ آپ صفحہ ۳۴۳ سے ۳۴۶ تک کا پورا مضمون دیکھیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ وہاں یہ گفتگو بالکل غیر متعلق تھی۔

اب آپ نے اس مسئلے کو چھیڑا ہے تو اس کے متعلق مختصراً عرض کیے دیتا ہوں۔ اہلِ موصل کے معاملہ میں ابن الاثیر اور الکردری کا بیان شمس الائمہ سرخسی کے بیان سے مختلف ہے۔ شمس الائمہ کہتے ہیں کہ اہلِ موصل، جنہوں نے بغاوت کی تھی، کفّار تھے اور منصور سے ان کا معاملہ یہ پیش آیا تھا کہ انہوں نے

منصور کے یرغمالوں کو قتل کر دیا تھا اور ان سے شرط یہ ہوئی تھی کہ اگر وہ ایسا کریں تو منصور کو بھی ان کے یرغمال قتل کر دینے کا حق ہوگا۔ شمس الائمہ کے بیان کی رو سے منصور نے یہی مسئلہ فقہاء کے سامنے پیش کیا تھا کہ میں اہل موصل کی اس شرط کے مطابق ان کے یرغمالوں کو قتل کرنے کا مجاز ہوں یا نہیں۔ دوسری طرف ابن الاثیر کا بیان ہے کہ موصل میں حسّان بن مجالد نے خروج کیا تھا۔ اور منصور نے فقہاء کے سامنے جو مسئلہ پیش کیا تھا وہ یہ نہ تھا کہ میں ان باغیوں کے خلاف قتال کر سکتا ہوں یا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ: انَّ اھلَ موصل شرطوا الیّ انھم لا یخرجون علیّ فان فعلوا احلّت دماؤھم و اموالھم۔ یعنی اہل موصل مجھ سے یہ شرط کر چکے ہیں کہ اگر آئندہ کبھی وہ میرے خلاف خروج کریں تو ان کے خون اور ان کے مال میرے لیے حلال ہونگے۔ خون اور مال کے حلال ہونے کا مطلب آپ خود جانتے ہیں کہ کسی کے خلاف محض قتال کا جائز ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ اگر ہم لڑ کر اس گروہ پر غالب آجائیں تو ہمارے لیے پھر اس کے تمام بالغ مردوں کو قتل کر دینا اور اس کے اموال لوٹ لینا حلال ہو۔ یہی سوال دراصل منصور نے فقہاء کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس کا جواب بعض دوسرے فقہاء نے یہ دیا کہ وہ لوگ خود از روئے معاہدہ اپنے خون اور مال آپ کے لیے حلال کر چکے ہیں، اس لیے آپ ایسا کرنا چاہیں تو اس کے مجاز ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ قریب قریب یہی بات الکردری نے بھی لکھی ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے۔ کیا امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان باغیوں پر اگر حکومت غالب آجائے تو وہ ان کے تمام بالغ مردوں کا قتلِ عام کر کے ان کے اموال لوٹ لینے کی مجاز ہے، قطع نظر اس سے کہ ان مسلمان باغیوں نے پہلے خود یہ شرط قبول کی ہو یا نہ کی ہو؟

میرے نزدیک اس معاملہ میں ابن الاثیر اور الکردری کا بیان ہی درست ہے اور شمس الائمہ کا بیان تاریخی طور پر درست نہیں ہے، کیونکہ منصور کے زمانے میں نہ تو موصل میں کوئی کافر حکومت تھی اور نہ کفار اہلِ ذمّہ کا وہاں اتنا زور تھا کہ وہ عباسی خلافت کے مقابلے میں بغاوت کر سکتے لیکن چونکہ میں نے اس سارے معاملہ کو ایک دوسرے ہی پہلو سے لیا ہے، اس لیے امام کی جرأت

حق گوئی کی مثال کے طور پر میں نے تینوں مصنّفین کا حوالہ دیدیا ہے، کیونکہ اس پہلو میں ان کے درمیان اتفاق ہے۔

مسلم اور مومن کے معنی

سوال۔ بعض حضرات اسلام اور ایمان کے الفاظ کو اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال کرتے ہیں۔ وہ اسلام سے مراد محض ظاہری اطاعت لیتے ہیں جس کی پُشت پر ایمان موجود نہ ہو۔ اور ایمان سے مراد حقیقی اور قلبی ایمان لیتے ہیں۔ ان کا استدلال سورۂ حُجُرات کی اس آیت (قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔۔۔۔) سے ہے، جس میں عرب بدؤوں کو مومن کے بجائے مسلم قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ایمان ان کے دل میں داخل نہیں ہوا ہے۔ بعض فرقے اس استدلال کی آڑ میں اپنے آپ کو مومن اور عامۃ المسلمین کو محض مسلم قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ خلفائے راشدین میں سے اصحابِ ثلاثہ کو بھی مومن کے بجائے مسلم کہہ کر درپردہ ان کے ایمان پر چوٹ کی جاتی ہے۔ براہِ کرم مذکورہ بالا آیت کی صحیح تاویل اور مومن و مسلم کی تشریح بیان فرمائیں۔

جواب۔ سورۂ حُجُرات کی آیت قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔۔۔۔ کو سورۂ توبہ کی آیات ۹۰ تا ۱۰۱ کی روشنی میں پڑھیے تو بات پوری طرح سمجھ میں آجائیگی۔ مدینہ سے باہر اطراف و نواح میں جو بدو رہتے تھے ان کو اعراب کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ صرف اس وجہ سے مدینے کی اسلامی حکومت کے تابع فرمان ہو گئے تھے کہ ان کے لیے اطاعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا۔ مگر نہ وہ جہاد میں جانیں لڑانے اور خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھے اور نہ زکوٰۃ خوشی کے ساتھ دینے پر راضی تھے۔ اِس پر ان کا رویّہ یہ تھا کہ جب مسلمانوں کے ساتھ فتوحات کے فوائد میں حصّہ بٹنے کا معاملہ آتا تھا تو یہ ایک سے ایک بڑھ کر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے اپنے دعاوی اس طرح پیش کرتے تھے گویا انہوں نے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر حضورؐ پر کوئی احسان کیا ہے۔ ان کے اسی رویّے کے متعلق سورۂ حُجُرات میں فرمایا گیا ہے

کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن دراصل انہوں نے صرف ظاہری اطاعت قبول کی ہے ایمان دل میں ہوتا تو نہ یہ جہاد سے جی چُراتے اور نہ اپنے قبولِ اسلام کا احسان نبی پر جتاتے۔

اس جگہ بلاشبہ اسلام کا لفظ ایمان کے بغیر صرف مطیع ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآن مجید میں اسلام اور ایمان دو الگ معنی ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے تو اس سے پوچھیے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام کے کیا معنی ہیں، اور حضرت ابراہیم کی اس دعا کا کیا مطلب ہے کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ۔

باقی رہا کسی گروہ کا خلفاء ثلاثہ اور تمام صحابۂ کرام کو (باستثناء چند) مسلم بلا ایمان قرار دینا، تو حقیقت میں یہ اُن پر نہیں بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چوٹ ہے۔ وہ دراصل ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور ایک انتہائی ناکام نبی تھے، کیونکہ آپ پر خود آپ کے چند اہلِ بیت اور تین چار صحابیوں کے سوا کوئی سچے دل سے ایمان نہ لایا، حتیٰ کہ آپ کی اکثر بیویاں بھی آپ کی مخلص پیرو نہ تھیں۔ اور اس کے ساتھ وہ حضورؐ کو نعوذ باللہ سخت بے بصیرت اور سادہ لوح بھی ثابت کرتے ہیں کیونکہ ان کے بقول سب منافق ہیں۔ اور عجیب بات ہے، یہ ظالم اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ۲۳ سال تک تمام عرب کے مقابلہ میں جدوجہد کر کے جو عظیم الشان کامیابی حضورؐ کو حاصل ہوئی وہ آخر کیسے حاصل ہو سکتی تھی اگر آپ کے یہ تمام ساتھی مخلص و وفادار اور جاں نثار و فدائی نہ ہوتے۔ سالہا سال تک عرب کی پوری قوم حضورؐ سے برسرِ پیکار رہی، اور یہی صحابہ آپ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ معاذ اللہ، یہ اگر منافق ہوتے تو عرب کیسے مسخر ہو جاتا؟ واقعہ یہ ہے کہ بغض اور تعصب میں جب آدمی اندھا ہو جاتا ہے تو سورج کی طرح روشن حقائق بھی اس کو نظر نہیں آتے۔

صدرِ ریاست کو ویٹو کا حق

سوال۔ کچھ عرصہ سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جارہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین

یا امیر المؤمنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لیے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حقِ تنسیخ ملنا چاہیے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلیل القدر صحابہ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا اور منکرینِ زکوٰۃ و مدعیانِ نبوت کی سرکوبی کے لیے جہاد کا حکم دیگر صحابہؓ کی رائے کو رد کر دیا۔ گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جا رہا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں جناب والا کی خدمت میں چند سوالات پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ بصراحت جوابات سے مطمئن فرمائیں گے۔

(۱) کیا حضرت ابوبکرؓ نے آج کے معنوں میں ویٹو استعمال فرمایا تھا۔ اور

(۲) اگر استعمال فرمایا تھا تو ان کے پاس کوئی شرعی دلیل تھی یا نہیں؟

جواب ۔ خلفائے راشدین کی حکومت کے نظام اور آج کل کے صدارتی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز صرف وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو اسلام کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں نے اس فرق پر مفصل بحث اپنی کتاب اسلامی ریاست میں صفحہ ۲۰۸ - ۲۰۹ پر کی ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کو خلافت کے نظام میں "ویٹو" کے اختیارات سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ موجودہ زمانے کی دستوری اصطلاح سے بالکل مختلف چیز تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے صرف دو فیصلے ہیں جن کو اس معاملہ میں بنائے استدلال بنایا جاتا ہے۔ ایک جیشِ اسامہؓ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابوبکرؓ نے محض اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا تھا، بلکہ اپنی رائے کے حق میں کتاب و سنّت سے استدلال کیا تھا۔ جیشِ اُسامہ کے معاملہ میں اُن کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں کر چکے تھے۔ اسے حضورؐ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینا میرا فرض ہے۔ میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا۔ مرتدین کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ بھی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتا ہو، اور یہ کہے کہ میں نماز تو پڑھوں گا مگر زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا، وہ مرتد

ہے۔ اسے مسلمان سمجھنا ہی غلط ہے، لہذا ان لوگوں کی دلیل قابل قبول نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے قائلین پر تم کیسے تلوار اٹھاؤ گے۔ یہی دلائل تھے جن کی بنا پر صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ یہ اگر ویٹو ہے تو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ کا ویٹو ہے نہ کہ سربراہ ریاست کا۔

حقیقت میں اسے ویٹو کہنا ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے استدلال کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرامؓ اس کی صحت کے قائل ہو گئے تھے اور اپنی سابقہ رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

(بقیہ اشارات)

بلکہ اس کا حقیقی نصب العین اسلام کا احیاء تھا اور اس وجہ سے جب کبھی کوئی ایسی متبادل صورت سامنے آئی جس سے مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی روایات کی حفاظت و پاسبانی ممکن ہوتی تو اسے اس مقصد کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر قبول کر لیا گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم اُن لوگوں میں نہیں جو حالات کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر نہ صرف حال کو بلکہ ماضی کو بھی تبدیل کر دیتے ہیں ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں۔ اس کارکردگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں اور اس میدان میں کسی حصّے کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان دراصل احیائے اسلام کی تحریک تھی اور تقسیم ملک کی کوشش اس مقصد کے حصول کا صرف ایک ذریعہ تھا۔ دوسرے لوگوں نے اس ذریعہ کے علاوہ اگر اسی مقصدِ عظیم کے لیے کسی اور طریقے پر کام کیا ہو تو انہیں تحریکِ پاکستان کا دشمن قرار دینا صریح زیادتی ہے۔ اگر تقسیم ملک کے علاوہ کسی دوسری متبادل صورت کو پیش کرنا یا قبول کرنا مسلمانوں سے غداری تھی تو اس جرم کا